

مقالات

رسالت

از جناب مولانا ابوالحسن علی صاحب داتا تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء

فطرت انسانی کے سوا انسان کی فطرت کچھ سوالات ہیں جو رہ کر اسکی گہرائیوں سے اٹھتے ہیں۔ ان سوالات کو نہ حیلوں بہانوں سے ٹالا جاسکتا ہے، نہ انکے جوابے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔ اس عالم کو کون چلا رہا ہے؟ اسکی کیا صفات ہیں؟ اسکا ہم سے اور ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟ اس کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟ اور یہ کہ اس زندگی کا انجام اور اس عالم کا منتہا کیا ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جو بالکل طبعی اور قدرتی ہیں اور انسان کی فطرت سلیم کو پورا حق ہے کہ وہ انسان سے پوچھے کہ وہ جس دنیا میں رہتا ہے اسکو کس نے بنایا اور کون اسکو چلا رہا ہے۔ پھر جب تک اسکو اس بنانے والے کی صفات نہ معلوم ہوں، اس کو اس سے کوئی قلبی لگاؤ اور ذہنی تعلق نہیں پیدا ہو سکتا۔ دنیا کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک کسی شخص کی سیرت اور اخلاق و صفات سے ہمیں واقفیت نہیں ہوتی ہمیں محض اسکے نام سے تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اگر ہم خالق کائنات کے متعلق اسکے سوا کہ وہ موجود ہے کچھ نہ جانتے ہوں، اسکی ربوبیت و رحمت، قدرت و اختیار، علم و اطلاع، محبت و رافت، اور اسکے جلال و جمال کی دوسری صفات اسکا ہم سے قریب ترین تعلق، اور ہماری اسکی طرف شدید ترین احتیاج، اور اسکے سہارا ہمارے قیام و بقا کا حال معلوم نہ ہو، اس سے ہمیں وہ تعلق پیدا نہیں ہو سکتا جو ایسی ذات سے پیدا ہونا چاہیے۔

اسی طرح وہ اپنے اس سوال میں بالکل حق بجانب ہے کہ زمین کی مملکت میں بسنے والوں کا صاحب مملکت کے کیا مطالبات ہیں۔ اس لیے کہ کسی سلطنت میں رہنے والوں کا یہ پہلا فرض ہے کہ اس کے سلطان کا نظام و قانون معلوم کریں۔

اسی طرح سے یہ بھی بالکل طبعی امر ہے کہ وہ اس زندگی کے متعلق جانتا چاہے کہ اس کا مال کیا ہے اور اسکے بعد کیا ہوگا؟ اس لیے کہ اس سوال کا تعلق نہ صرف اسکے مستقبل سے ہے بلکہ اسکے حال سے بھی ہے۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی بھی ہے جس میں پہلی زندگی کا حساب کتاب ہوگا، اور اس پہلی زندگی کے اعمال کے مطابق اسکو جزا و سزا ملے گی، اس شخص کا طرز عمل موجودہ زندگی میں اس شخص سے بالکل مختلف ہو گا جو موجودہ زندگی کے علاوہ کسی دوسری زندگی کا کوئی تصور نہیں رکھتا۔ اسی لیے یہ سوال اسکی اس زندگی میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اسکے جواب میں تاخیر کی گنجائش نہیں، کیونکہ اس مسئلہ کو طے کیے بغیر اس زندگی کی صحیح تشکیل نہیں ہو سکتی۔

ہماری زندگی کے یہ بنیادی سوالات ہیں جن پر نجات و سعادت کا دار و مدار اور ہماری قسمت کا فیصلہ موقوف ہے، جنکے جواب میں ذرا سی غلطی اور لغزش ہماری ابدی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ زندگی ہم کو صرف ایک مرتبہ کے لیے ٹی ہے اور یہ ہماری سب سے قیمتی متاع ہے۔ وہ محض قیاس و تخمین، اور آزمائش و تجربہ میں گزار دی نہیں جاسکتی۔

ان سوالات کے علاوہ کچھ سوالات اور بھی ہیں اور ان کا تعلق بھی ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ ہمارا اپنے گرد و پیش کی دنیا سے اور اس کا ہم سے کیا تعلق ہے؟ اس ہنگامہ ہستی میں ہماری حیثیت اور ہمارے وجود کا مقصد کیا ہے؟ ہم ماتحت ہیں یا خود مختار؟ ذمہ دار ہیں یا غیر ذمہ دار؟ اگر ذمہ دار ہیں تو کس کے سامنے اور ہماری ذمہ داری کس حد تک ہے؟ ہماری قوتیں اور صلاحیتیں

ہماری اپنی ہیں یا کسی دوسرے کی ملک؟ انکا طریق استعمال کیا ہے؟ اس زندگی کا کمال مطلوب اور مقصد کیا ہے؟ اور ایسے متعدد سوالات ہیں، جو ہمارے لیے فطری طور پر حل طلب ہیں اور زندگی کے مرکزی سوالات ہیں۔

سوالات کے جواب کی دورانیہ | ان سوالات کے جواب کی دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ انکا جواب ہم اپنے ذاتی علم و فہم اور غور و فکر کی بنا پر خود دیں۔ لیکن اس طریقہ سے ہم زیادہ سے زیادہ جس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں وہ یہ ہو گا کہ اس عالم کا کوئی بنانے والا ضرور ہے۔ یہ سوال کہ اسکی صفات کیا ہیں؟ تو اسکا جواب ہم اپنے ذاتی تفکر کی بنا پر نہیں دے سکتے۔ ہمارا دفاع اپنی انتہائی بلند پروازیوں میں بھی قیاس کے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا اور یہ معاملہ ایسا ہے کہ اس میں قیاس کی گنجائش نہیں، اس لیے کہ خالق و مخلوق کے درمیان کوئی مشابہت ہی نہیں ہے کہ عالم خلق کی مشبہ و محسوس اشیاء کو دیکھ کر خالق کی صفات کا تصور کیا جاسکے۔

اس کے بعد دوسرا مشکل سوال اسکا تعین ہے کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے، کیا اسکو پسند ہے اور کیا ناپسند۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دوستوں اور عزیزوں اور خاص رفیقوں کی خوشی، پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے بارے میں بھی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے اور اس میں بعض مرتبہ بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ پھر ایک ناویدہ ذات اور رازدار اور اہستی کی مرضیات و نامرضیات کی یقینی تعین بعض قیاس سے کس طرح ممکن ہے۔

پھر اس علم و فہم اور غور و فکر کا نتیجہ ایک نہیں ہے۔ نتیجہ میں سخت اختلاف و تعارض ہے۔ کسی نے اپنے غور و فکر کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کارخانہ بغیر کسی بنانے والے کے بن گیا اور بغیر کسی چلانے والے کے چل رہا ہے اور خود ہی ختم ہو جائیگا۔ کسی کے نزدیک اسکا اگر کوئی صانع ہے تو اسکا یہ صانع کوئی تعلق نہیں رہا۔ کسی کے نزدیک اسکا صانع ہی اسکا حقیقی مالک تھا مگر اب دوسروں کے حق

میں اپنے مالکانہ حقوق سے دست بردار ہو گیا ہے اور اسکی مملکت میں اب بادشاہی کر رہے ہیں۔ کسی نے اس دنیا کی ہر چیز کو جس سے اسکو بظاہر نفع و ضرر پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے اپنا الٰہ (معبود) اور ہر صاحب طاقت کو اپنا حاکم بنا لیا، اور اسکے ظاہری حواس، روزمرہ کے تجربات اور عقل و فہم نے اسکو ایسی نتیجہ پر پہنچایا۔ کسی نزدیک انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جو کچھ ضرورتیں رکھتا ہے اور کچھ خواہشیں۔ وہ آزاد و خود مختار ہے اور قطعاً غیر مسؤل۔ اسکی طاقت غیر مقید اور اسکا اختیار غیر محدود ہے۔ اسکے قانون کا نہ کوئی اعلیٰ ماحذ ہے نہ اسکے علم کا کوئی غیبی سرچشمہ۔ دنیا ایک ہنگامہ کارزار ہے جس میں اصل قانون طاقت ہے، اخلاق خیر و شر، حسن و قبح یہ سب بے معنی الفاظ ہیں۔

خدا کی ہستی کو تسلیم کرنے کے بعد اسکے صفات کے بارہ میں حکما را اور فلاسفہ نے جو جو قیاس آرائیاں اور موثکافیاں کی ہیں اور جس طرح انہوں نے اسکی طرف اُن نقائص کی نسبت کی ہے جبکی نسبت وہ خود اپنی طرف پسند نہیں کرتے وہ انسانی عقل کے عجائبات میں سے ہے۔

کچھ سوالات یعنی اس عالم میں انسان کا اصل محل و مقام کیا ہے، اسکی حیثیت و مقصد کا تعین، دوسری مخلوقات اور اپنے ہم جنسوں اسکے طرز عمل کی تعیین، ماتحتی اور خود مختاری، ذمہ داری اور آزادی کی بحث، اپنی قوتوں اور ظاہری ملکیتوں کے متعلق اسکا خیال، یہ سب درحقیقت پہلے سوالات کا ضمیمہ ہیں اور اُنکے صحیح حل سے یہ خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ابتدائی سوالات کے حل کرنے میں غلطی کی اور قیاس آرائی سے کام لیا، ان سوالات کے جواب میں بھی انکا غلطی میں مبتلا ہونا اور انکے قیاسات میں اختلاف و تعارض اور شک و احتمال واقع ہونا لازمی تھا۔

۱۔ یہ سب اقوال و عقائد جاہلیت اولیٰ، جاہلیت وسطیٰ اور جاہلیت جدیدہ کے عقائد اور فلاسفہ کے ہیں، تفصیل کے لیے

ملاحظہ ہوں کتب فلسفہ و مابعد الطبیعیات

۲۔ ملاحظہ ہوں اقوال حکما ریونان، و ابن سینا و ابن رشد۔

جواب کی دوسری راہ یہ ہے کہ ہم اس بارہ میں کسی دوسری جماعت پر اعتماد کریں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت کونسی ہے؟ اگر وہ حکما کی جماعت ہے، تو پوچھا جاسکتا ہے کہ ان مسائل میں انکو ہمارے مقابلہ میں کونسا امتیاز حاصل ہے اور ان مابعد الطبیعیاتی مسائل کے حل کے انکے پاس کونسا علمی ذرائع ہیں؟ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسائل میں نہ حواس کام کرتے ہیں نہ عقل کا کچھ دخل ہے نہ انکو اس علم کے مبادی بھی حاصل نہیں ہیں۔ پھر انکو اس بارہ میں ہماری رہنمائی کا کیا حق ہے اور ہم ان پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں؟ ان سے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے:

هَآ اَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجِّتُمْ
فِيْمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ
فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ
وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (آل عمران)

تم نے اُن مسائل میں تو بحث کر لی جنکا تم کو
دھوڑا بہت (علم تھا۔ مگر اب ایسے مسائل میں کیوں
بحث کرتے ہو جنکا تمکو کچھ بھی علم نہیں؟ — اللہ جانتا
ہے تم نہیں جانتے۔

اب صرف یہی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ان مسائل میں ہم کچھ ایسے انسانوں پر اعتماد کریں جنکا علم اس بارہ میں قیاسی ہو بلکہ یقینی اور قطعی ہو، جنہوں نے ان علوم و حقائق کو اپنے مشاہدہ اس طرح حاصل کیا ہو جس طرح ہم کو اس عالم کے مسوعات و مبصرات کا علم ہوتا ہے، جن کے لیے یہ چیزیں ایسی ہی بدیہی ہوں جیسی ہمارے لیے دنیا کی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں، جنکو مشترک انسانی حواس کے علاوہ ایک خاصہ زائد ملا ہو جسے ہم خاصہ غیبی کہہ سکتے ہیں، جو خدا سے براہ راست اسکی مرضیات اور احکام معلوم کر سکیں اور دوسرے انسانوں تک پہنچا سکیں۔ یہ صرف پیغمبروں کی جماعت ہے۔ انکی بے باغ سیرت، انکی بے لاگ صداقت، انکی فوق البشری حکمت و عدالت، انکی معجزانہ تعلیم اس بات کا اذعان پیدا کر دیتی ہے کہ یہ ایک الگ نوع کے لوگ ہیں اور انکا علم و اطلاع کے اُس سرچشمہ سے ضرور اتصل ہے جو انسانوں کی دسترس سے باہر ہے۔ انکے خارق عادت صفات علوم کی کوئی

توجہ اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ ان کا نبی ہونا اور اُن کے پاس وحی کا آنا تسلیم کیا جائے۔

سابق الذکر جماعتیں (حکما و فلاسفہ) اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا خود بھی دعویٰ نہیں کرتیں، نہ انکو اس بارہ میں کسی مشاہدہ کا دعویٰ ہے۔ اُن کے اقوال و دعاوی کا حاصل بس یہ ہے کہ ایسا ہوگا، یا ایسا ہونا چاہیے، یا ہمارا قائم کیے ہوئے مفادات (جو بدیہی اور قطعی الثبوت نہیں ہیں) ہم کو اس نتیجہ پر پہنچا رہے ہیں۔ اور وہ اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔

لیکن پیغمبروں کو اپنے علم کے یقینی اور قطعی ہونیکا دعویٰ ہے۔ وہ صرف یہی نہیں کہنے کہ خدا ہے یا اسکی یہ صفات ہیں۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم اسکی باتیں سنتے ہیں، ہم اس سے ہمکلام ہوتے ہیں، ہمارا پاس اس کے پیغام پہنچتے ہیں، ہمارا پاس اُس کے فرشتے آتے ہیں۔ اُن کے لیے کوئی چیز اتنی یقینی اور بدیہی نہیں جتنی خدا کی صفات، اس کے احکام و پیغام اور اپنی نبوت و رسالت۔ اسیلئے انکو ایک لمحہ کے لیے بھی ان حقائق میں کوئی شک و تذبذب نہیں اور کسی کے کہنے سننے سے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

پیغمبر نبوت و رسالت کے اس بلند مقام پر کھڑا ہوتا ہے جہاں سے وہ عالم غیب کو بھی اُسی طرح دیکھتا ہے جس طرح عالم شہد کو، عالم آخرت بھی اس کے سامنے اُسی طرح ہوتا ہے جس طرح یہ دُنیا۔ جو لوگ اس بلندی پر نہیں ہیں اور زمین کی پستی سے اس کے مشاہدات بارہ میں اُس سے بحث و محبت کرتے ہیں وہ ان سے اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہے کہ میری آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جو تم نہیں دیکھ سکتے، میرے کانوں میں وہ آوازیں آتی ہیں جو تم نہیں سن سکتے، تمہارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سُن کر جو کچھ کہوں تم اسکا یقین کرو، تمہاری نجات اسی میں ہے۔

۱۔ کہ صفائی تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اہم نکتہ کو جو پیغمبر اور غیر پیغمبر کے فرق کو واضح کرتا ہے نہایت دلنشین انداز میں بیان فرمایا۔ آپ نے پہلا طریقہ کھیلے ہوئے قوم سے پوچھا کہ تم نے آج تک کبھی کیا پایا؟ سب نے بالاتفاق کہا کہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچا اور امان پایا۔ پھر آپ نے کہا کہ اچھا اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑی کے عقب میں ایک لشکر بڑا ہوا ہے جو غفلت کی حالت میں تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو تم اسکو باور کرو گے؟ لوگوں نے کہا کہ اس کے یقین نہ کریں گی ہمارا پاس کوئی وجہ نہیں (اسی لیے کہ آپ کی صداقت کا تجربہ ہے اور آپ ایسے بلند مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے آپ کو وہ نظر آ سکتا ہے جو ہم کو نظر نہیں آ سکتا)۔ اس اقرار کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ اللہ کا عذاب آئے گا (اللہ ہے)۔ اس حقیقت افزہ پیغمبرانہ تقریر میں آپ نے پیغمبر کی انہیں دونوں (توحید و رسالت)

ایک پیغمبر سے جب اسکی قوم نے خدا اور اسکی صفات بارہ میں حجت کی تو اس نے نہایت سادگی سے

اپنا اور بے دلیل بحث کرنے والوں کا فرق بیان کیا

وَحَاجَّةُ قَوْمِهِ قَالَ أَتَحَاجُّونِي

اور اس اسکی قوم نے حجت کی۔ اس نے کہا کہ کیا تم مجھے اللہ

فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ دَانِغَام

کے بار میں حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے میری رہنمائی کی ہے؟

ایک دوسرے پیغمبر نے یہی فرق اس طرح بیان کیا :-

قَالَ يَقُومُ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَى

اس نے کہا کہ لوگو! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کے صاف راستہ پر ہوں

بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَإِنِّي رَحْمَةٌ مِنْ عِنْدِهِ

اور اس نے مجھے اپنے پاس رحمت بخشی پھر وہ تمہاری نظر سے غفلت میں

أَفَنُلْزِمُكُمْ سَوْحًا وَأَنْتُمْ لِمَا كَرِهْتُمْ (ہو میں)

کیا ہم تمکو اس پر مجبور کر سکتے ہیں جبکہ تم اسکو پسند نہیں کرتے۔

ایک تیسرے پیغمبر نے متعلق یوں کہا گیا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا

وہ اپنے نفس کی خواہش سے نہیں بولتا وہ تو

وَحَىُّ يُوحَىٰ (الحم۔ ۱)

وحی ہے جو وحی کی جا رہی ہے۔

اسی مشاہدہ کے متعلق کہا گیا:

مَا تَرَاعَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ لَقَدْ رَأَىٰ

نہ اسکی نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی بے شک اس نے اپنے رب

مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ (الحم۔ ۱)

کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ أَفَتُنَادِي

رسول کے دل نے جھوٹ نہیں کہا جو کچھ کر دیکھا۔ کیا تم اس سے

عَلَىٰ مَا يَرَىٰ (الحم۔ ۱)

جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس پر جھگڑتے ہو؟

(تقریباً حاشیہ ص ۲۱) خصوصیتوں کی وضاحت فرمائی۔ ایک اسکی اعلیٰ صداقت اور پاکیزہ میریت۔ دوسرے اسکی خدا داد پیغمبری اور مشاہدہ فیہی جو دوسرے انسانوں کو حاصل نہیں اور جسکی بنا پر دوسرے انسانوں کے لیے اسکی تقلید کے سوا چارہ نہیں۔

ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام
ﷺ حضرت ہود علیہ السلام
ﷺ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اس یقین و مشاہدہ کے مقابلہ میں جو کچھ ہے اسکی حقیقت سن لیجیے۔

وہ محض اٹکل اور دل کی خواہشوں پر چلتے ہیں حالانکہ انکے پاس اٹکلے رب کی طرف سے ہدایت آچکی۔

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ
مِّن رَّبِّهِمْ الْهُدَىٰ (البغم - ۱)

ان کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں، وہ محض اٹکل پر چلتے ہیں اور قیاس حقیقت کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔

وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ
لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (البغم - ۲)

زندگی کی مکمل توجیہ وحی اور ان مابعد الطبیعیاتی سوالات کے علاوہ جنکا جواب ہے بغیر ہماری زندگی حیوانی زندگی سے پیغمبر کی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں ممتاز نہیں ہو سکتی، ہم یوں بھی وحی کی روشنی اور پیغمبروں کے نور بصیرت کے بغیر اپنی زندگی کی مکمل توجیہ نہیں کر سکتے اور نظام کائنات کے حقیقی مرکز اور اس ہمہ گیر اور حکیمانہ قانون کو دریافت نہیں کر سکتے جو اس عالم میں کارفرما ہے۔ اپنی ذاتی بصارت ہم کو یہ زندگی ایک وحدت کے طور پر نظر نہ آئیگی، بلکہ ایک منتشر شیرازہ ملیگا جسکے اوراق بکھرے ہوئے ہیں۔ اسکی کچھ سطریں اور اسکے بعض عنوانات ہم غور کر کے پڑھ سکتے ہیں۔ مگر اس صحیفہ کائنات کا موضوع، اس کتابِ خلاصہ اسکے مصنف کا مافی الضمیر ہم کو پیغمبروں کی بصیرت کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا۔

حکما اور ماہرین طبعیات کائنات سے متعلق جو تحقیقات کی ہیں، زندگی سے متعلق جن حقائق کا انکشاف کیا ہے، طبعی قوتوں کو اپنے علم و تجربہ سے انسان کے لیے جس طرح مسخر کیا ہے اور جس طرح کائنات کے ایک ایک شعبہ اور زندگی کے ایک ایک گوشہ کے لیے مستقل علوم مرتب کیے اور کتابت فرما کر دیے وہ بلاشبہ انسانی علم کا ایک کارنامہ ہے۔ لیکن یہ جو کچھ بھی ہے یہ زندگی اور کائنات کے اصل مجموعہ کے کسور و اجزا ہیں جن میں باہم کوئی ربطہ نہیں ہے، نہ انکا کوئی مرکز معلوم ہے۔ یہ

سب کس نظام کے ماتحت ہیں؟ کس مقصد کے تابع ہیں؟ کس اہم غرض کے خادم ہیں؟ ان سوالات کا کوئی جواب حکماء اور طبعیین کے پاس نہیں ہے۔ حالانکہ علمی حیثیت کے ہمارے لیے یہی سوالات زیادہ اہم ہیں، اور علمی حیثیت کے بھی انکی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ اخلاق، طرزِ عمل اور زندگی کے بنیادی نقطہ نظر کا انحصار انہی سوالات پر ہے۔ حکماء اور طبعیین نے اپنا سفر اصلی نقطہ آغاز (خالق کی معرفت) سے شروع نہیں کیا، اس لیے وہ ہمیشہ آفاق میں گم رہینگے اور زندگی کے معرکہ کو کبھی حل نہ کر سکیں گے۔

لیکن اسکے بالکل برخلاف جب ہم وحی کی روشنی اور پیغمبر کی بصیرت کے اس عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایک وحدت "نظر آتا ہے" اور ایک اعلیٰ وحدانی نظام معلوم ہوتا ہے جس کے اجزاء میں باہم پورا ربط و تعلق ہے، یہ سب ایک مرکز کے تابع ہیں، انکی ہر حرکت و عمل ایک مقصد کے ماتحت ہے، ان میں نہ باقتصاد ہے، نہ خود مرکزیت، دنیا ایک مرتب و متوازن مشین ہے جس کا ہر پرزہ اپنی جگہ پر کارآمد ہے اور دوسرے پرزہ کی امداد کر رہا ہے، یا ایک بڑا کارخانہ ہے جس میں صد ہا مشینیں چل رہی ہیں، ہر مشین کو دوسری مشین سے پورا تعلق ہے اور یہ پوری مشین یا پورا کارخانہ ایک صاحب علم و صاحب اختیار طاقت کے ہاتھ میں ہے جو اس کو ایک قانون اور نظام کے ماتحت جو اسی کا وضع کیا ہوا ہے چلا رہا ہے۔

انبیاء اور محققین کے طریق نظر | انبیاء اور حکماء و محققین کے طریق نظر اور طریق کار کا اس کائنات کے اور طریق کار کا اختلاف بارہ میں جو اختلاف ہے اسکی وضاحت ہم ایک مثال سے کرتے ہیں۔ کسی شہر میں علماء و محققین کی ایک جماعت داخل ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ یہ تحقیق کرتا ہے کہ اس شہر کا محل وقوع کیا ہے، اسکے حدود و اربعہ کیا ہیں، اسکا عرض البلد اور طول البلد کیا ہے اسکے پاس کتنے دریا اور کتنے پہاڑ ہیں، دریا کہاں سے آتے ہیں اور پہاڑ کہاں تک جاتے ہیں، شہر کا رقبہ کیا ہے، وہاں کیا کیا چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جغرافیہ دانوں کا گروہ ہے۔ دوسرا گروہ یہ دریا

کرتا ہے کہ شہر کب سے آباد ہے، شہر میں کون کون سے آثار قدیمہ پائے جاتے ہیں، انکی تاریخ کیا ہے۔
یہ مورخین اور علماء آثار کی جماعت ہے۔

کچھ لوگ اسکی زمین کی حیثیت معلوم کرتے ہیں: کھدائیاں کرتے ہیں اور اسکی معدنیات دریافت کرتے ہیں۔ یہ ماہرین طبقات الارض کا گروہ ہے۔

کچھ لوگ وہاں ایک رصد گاہ قائم کرتے ہیں جہاں سے سیاروں اور ثوابت کا مطالعہ کرتے ہیں، انکے زمین سے فاصلے دریافت کرتے ہیں، زلزلوں اور بارشی ہواؤں کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ یہ علماء طبعیات و ہیئت کی جماعت ہے۔

کچھ لوگ وہاں کیمیائی محل قائم کرتے ہیں، جہاں ادویہ خواص کا تجربہ کرتے ہیں، مفردات و مرکبات کا تجربہ کر کے نئی نئی تحقیقات کرتے ہیں۔ یہ علم الکیمیا اور نباتات کے ماہر ہیں۔

کچھ لوگ شہر کی زبان کے متعلق تحقیق کرتے ہیں، اسکے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اسکے لغت کی تدوین اور اسکے قواعد وضع کرتے ہیں۔ یہ ادبا اور علماء السنہ کی جماعت ہے۔

کچھ صاحب فوق ان خشک مباحث سے ہٹ کر جمالیات کی طرف توجہ کرتے ہیں، پھولوں، پتوں، اور مناظر طبعی کا لطف اٹھاتے ہیں اور انکے متعلق موثر و دل فریب پیرایہ میں اظہارِ ثناء کرتے ہیں۔ یہ شعرا کی جماعت ہے۔

کچھ لوگ وہاں کے عادات و رسوم اور اخلاق کا مطالعہ کرتے ہیں اور انکی تنقید کرتے ہیں۔ وہ سراغ لگاتے ہیں کہ یہ عادات و رسوم ان میں کہاں سے داخل ہوئے، کس طرح پیدا ہوئے، ان میں سے کون صحیح ہیں اور کون قابل اصلاح۔ یہ علماء اجتماع و اخلاق ہیں۔

کچھ لوگ شہر کے متعلق کچھ اصلاحات پیش کرتے ہیں، شہر کی تنظیم و ترقی اور اہل شہر کی آسائشی کے لیے ان کے پاس کچھ تجاویز ہوتی ہیں۔ یہ علماء تمدن ہیں!

یہ سب جماعتیں اپنے اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہیں اور دلچسپی اور اہمک کے ساتھ اپنے اپنے شعبوں کی تحقیقات کرنے لگتی ہیں۔

اب ایک شخص اس شہر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ پورے شہر پر ایک گہری نظر ڈالتا ہے۔ وہ دیکھتا اور سنتا سب کچھ ہے مگر مشغول کسی چیز میں نہیں ہوتا۔ اسکے نزدیک اہم سوالات یہ نہیں ہونے کہ شہر کا رقبہ کیا ہے، اسکی تاریخ کیا ہے، اسکی زمین کی تہہ میں کونسی معدنیات پائی جاتی ہیں، اور وہ دوسرا مور جو سابق الذکر جماعتوں کے نزدیک اہم تھے۔ اسکے سامنے اولین اور اہم ترین سوال یہ ہوتا ہے کہ شہر اس حسن و صنعت کے ساتھ کس نے تعمیر اور آباد کیا؟ یہاں کس کی حکومت ہے؟ شہر کا باشندے کس کی رعیت ہیں؟ شہر کی آبادی اور عام زندگی سے شہر مالک اور حاکم کا کیا اور کیا تعلق ہے؟ وہ حکومت اور رعیت کے درمیان واسطہ بنتا ہے، حکومت کا ترجمان اور اسکے احکام کا شارح ہوتا ہے۔ پس وہ تمام علمی اور تحقیقی جماعتیں مل کر بھی اس ایک شخص کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں، اسکے بغیر یہ پورا شہر ایک عجائب خانہ اور سیرگاہ بن کر رہ جاتا ہے۔

انبیاء کا طریق نظر حکماء اور محققین سے اصولی طور پر جدا ہوتا ہے۔ انکا کام موجودات کے اسرار و حقائق کا انکشاف و تحقیق نہیں، انکا اصل موضوع ”موجد کی ذات اور صفات اور اسکے احکام“ ہے۔ صحیفہ کائنات کے اوراق و صفحات انکے سامنے بھی اسی طرح کھلے اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح دوسرے اہل نظر کے سامنے۔ مگر انکی نظر کہیں اٹکتی الجھتی نہیں۔ انکا اس صحیفہ کے مصنف سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ وہ ”آفاق“ و ”انفس“ ہیں اسکی کھلی نشانیاں دیکھتے ہیں، اور اسکی سلطنت کا ایسا مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس زمین و آسمان میں انکو صرف اسی کا حکم چلتا نظر آتا ہے، اور صرف اسی کی بادشاہی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اسکا قانون انکو کسی گوشہ میں بھی ٹٹا نظر نہیں آتا، اسکا حکم کہیں بھی انکو ٹٹا دکھائی نہیں دیتا، تمام بلندیاں اسکے سامنے سرافکندہ دکھائی

یہی خدا کی وہ بادشاہی ہے جو انکو بے نقاب دکھائی دیتی ہے، جبکہ علم سب سے بڑا علم اور حقیقتہ الحائق ہے، جس سے حکما و محققین کے علوم کو ذرہ کی بھی نسبت نہیں، اور جس کے مقابلہ میں انکی حقیقت طفلانہ معلومات سے زیادہ نہیں :-

وَكُنَّا إِلَٰكُ نُزِيْ اِبْرَاهِيْمَ
مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيْكُوْنُ
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (انعام - ۹)

اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمان اور زمین
کی بادشاہی دکھاتے رہے تاکہ اس کو
یقین آجائے۔

انبیاء کی فطرت، انکی عقل اور انکا قلب سلامت اور ذکاوت کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ انکی فطرت سلیم کا خاصہ ہے کہ انکو ہوش سنبھالتے ہی اس عالم کے خالق اور منتظم کی سچی جستجو اور اسکی طلب صادق پیدا ہوتی ہے اور انکی پیچیدہ روح اور انکے مضطرب قلب کو اسوقت تک تسکین نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اسکو پا نہیں لیتے۔ انکی فطرت سلیم پہلے سے ان میں اسکا یقین پیدا کر دیتی ہے کہ اس عالم کا خالق و مالک اور انکا مربی کوئی ضرور ہے۔ وہ اس سے رہنمائی کے طلبگار رہتے ہیں اور اسکو اُسی کی مدد سے ڈھونڈتے ہیں۔ وہ عین تلاش و جستجو میں بھی اس سے علیحدہ نہیں ہوتے اور کہتے ہیں :

اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی تو میں
بھٹکے ہوئے لوگوں میں سے ہوتا۔

انکی عقل سلیم کا خاصہ یہ ہے کہ انکو اس دنیا کی ہر نمود عارضی اور ہر بہار فانی معلوم ہوتی ہے۔

انکو تارے، چاند، سورج سب ”آفل“، غروب ہو جانے والے، زوال پذیر اور شکست خوردہ معلوم ہوتے ہیں۔ انکو کسی کے متعلق دائمی اور ابدی، جاودان و بے خزاں ہونیکا دھوکا نہیں ہوتا۔ انکے قلب سلیم کا خاصہ یہ کہ وہ ”آفل“ کو اپنی محبت و عشق کے لائق نہیں سمجھتے اور اس سے دل لگانا پسند نہیں کرتے اور انکو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتے ہیں۔

لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ (انعام-۹) میں غائب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
انکو حی و قیوم ذات کی تلاش ہوتی ہے، پھر جب وہ انکو مل جاتی ہے تو وہ اس علم کے بعد صبر نہیں کر سکتے اور پکار کر کہہ دیتے ہیں:

إِنِّي بَرِيٌّ مِّمَّا تَشْرِكُونَ هِ اِنِّي وَتَجْتُ
وَحْمِي لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ (انعام-۹)
میں ان سے بری ہوں جنکو تم شریک کرتے ہو، میں ہرگز
منہ پھیر کر اپنا رخ اسکی طرف نہیں کرتا جس نے زمین اور آسمان
کو پیدا کیا اور میں اسکی شریک نہیں کرتا جو لوگ اس سے نہیں
یہی قلب سلیم ہے جس میں اللہ کے سوا کسی دوسری گنجائش نہیں ہوتی اور جو غیر اللہ کی عظمت
و کبریائی کے تمام نقوش سے سادہ ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ یہی فطرت سلیم، یہی عقل سلیم اور یہی
قلب سلیم رکھتے تھے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ نُورًا
مِّن قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عَلِيمِينَ (الانبیاء)
اور ہم نے پہلے ہی ابراہیمؑ کو بھی نور عطا کیا
تھا اور ہم اسکی لیاقت جانتے تھے۔
وَإِذْ جَاءَ رَبُّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ فَقَالَ لَا يَتَّبِعُ
وَقَوْمَهُ مَا ذَا تَعْبُدُونَ هَ أَفْكَآ أَلِمْهٖ
دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ هَ فَمَا ظَنُّكُمْ
اور نوحؑ کی طرح پرچنے والوں میں ایک ابراہیمؑ تھا جبکہ
اپنے رب کے حضور صاف تھرا دل بیکر آیا۔ پھر اس نے اپنے
باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ تم کسی پرستش کر رہے ہو؟
اللہ کے سوا دوسرے جعلی الہوں کے مرید بنے ہو؟ آخر رب

کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (الصفۃ - ۳)

پھر انکو اس کی جستجو ہوتی ہے کہ اس دنیا کی آبادی اور زندگی کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ جو آج زندہ ہیں وہ کل مرینگے۔ پھر کیا یہ کروڑوں ذی عقل حیوانوں کی آبادی زمین کے کیڑوں اور پانی کے بلبوں کی طرح فنا ہو جائیگی؟ کیا یہ عظیم الشان کارخانہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ پھوٹ کر بے نتیجہ ختم ہو جائیگا؟ کیا اسکے حکیم مبدء نے اس کو اسی بربادی کے لیے پیدا کیا ہے؟ کیا اسکی حکمت اس ”فعل عبث“ پر راضی ہے؟ کیا اچھے اور برے اعمال و اخلاق سب یونہی حاصل رہینگے جس طرح اس زندگی میں تھے؟ کیا نیکیوں کا تخم اسی طرح مٹی میں ملا رہیگا اور بدی کا بیج اسی طرح پھلنا پھولتا رہیگا؟ وہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ زندگی کا طبعی قانون ایسا ہے کہ اعمال و اخلاق کے مناسب اخلاقی نتائج ظاہر نہیں ہونے پاتے۔ بارہا ظالم کو فطرت کی طرف سے اسکے ظلم کی سزا نہیں ملتی۔ بد اخلاقوں اور گناہگاروں کو انکی بد اخلاقی اور گناہ کے نتائج بھگتنے نہیں پڑتے۔ نیکو کاروں اور پاکبازوں کے لیے اکثر یہ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے۔ تو کیا کوئی دن ایسا نہ آئے گا اور کیا کوئی ایسا نظام قائم نہ ہوگا جس میں مظلوموں کے ساتھ انصاف ہوگا؟ ظالموں کو انکے ظلم کی سزا ملے گی؟ حقداروں کو غاصبوں انکا حق دلایا جائیگا؟ کوششوں کا پھل کوششوں کی نوعیت کے مطابق ظاہر ہوگا؟ انکے ان سوالات اور اشکال کو بھی مدھی حل کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ عالم ایک مرتبہ ٹوٹ کر دوبارہ بنیگا، انسان مر کر دوبارہ زندہ ہونگے، اُس نئے عالم اور نئی زندگی کا نظام اس عالم اور اس زندگی سے مختلف ہوگا، یہاں صرف قانون طبعی کا رفرما ہے، وہاں قانون اخلاقی کا رفرما ہوگا۔ یہاں جن اخلاق و اعمال کا خاصہ اور انکی فطرت ظاہر نہیں ہوئی وہاں ظاہر ہوگی، نیکو کاروں کی نیکی اور بدکاروں کی بدی انکے سامنے آئیگی، وہ سب تخم جو دنیا کی اس کشت زار میں ڈالے گئے تھے اور مٹی کے نیچے دبے ہوئے تھے وہ اپنے اصل برگ بار لائینگے اور انکے پونے والے انکے میٹھے

اور کڑوے پھل کھا ئینگے، وہ عالم اس عالم کا ایک تہہ ہے جسکے بغیر اس عالم کی تکمیل نہیں ہوتی، جسکے بغیر اس عالم کی آفرینش ایک فعل عبث ٹھیرتی ہے، جسکے بغیر اس عالم کے اخلاقی قوانین اور احکام بے معنی اور فضول ہو جاتے ہیں۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (المومنون)
 کیا تم نے سمجھا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار ہی پیدا کیا اور تم ہمارے پاس لوٹ کر نہ آؤ گے؟
 اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنَّنَجْعَلُہُمْ كَالَّذِينَ اٰمَنُوْا وَاَعْمَلُوا الصَّٰلِحٰتِ سَوَآءٌ مَّحْيٰہُمْ وَمَمَاتُہُمْ سَآءٌ مَا يَحْكُمُوْنَ ہ
 جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہیں کیا انہوں نے سمجھ رکھا کہ ہم انکو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور چھوٹے اچھے کام کیے؟ انکا جینا مرنایکساں ہوگا؟ یہ کیسی بری رائے قائم کرتے ہیں.....

وَاَخْلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَہُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (جاثیہ)
 حالانکہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہ کیا جائیگا۔

حکما ر اور باہرین علوم کا دامن اور انکے بڑے بڑے کتبخانے ان معلومات کے بیکسر خالی ہوتے ہیں جو انبیاء کو خدا کی طرف سے ملتی ہیں۔ انکو آخرت کی اُن منزلوں کی ہوا بھی نہیں لگی ہوتی جنکی انبیاء علی وجہ البصیرۃ خبر دیتے ہیں اور جنکے متعلق تفصیلی ہدایات دیتے ہیں۔ انکی تلک دو دنیا کی حد تک ہے، موت کی سرحد کے پار وہ جہانک گر دیکھ نہیں سکتے۔

يَعْلَمُوْنَ ظٰہِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَہُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ ہُمْ غٰفِلُوْنَ (الروم)
 وہ دنیا کی زندگی کا ظاہری علم رکھتے ہیں اور آخرت سے بالکل بے خبر ہیں۔
 بَلِ اِذَا رَاٰكَ عَلٰیہُمْ فِی الْاٰخِرَةِ
 ان کا علم تحک کر رہ گیا آخرت کے بارہ میں، بلکہ

بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِنْهَا بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُونَ وہ اسکی طرف شک میں ہیں بلکہ اسے نابینا ہیں۔

حکماء اور ماہرین علوم کی حقیقت انسانی سفینہ کے ان ناخداؤں کے مقابلہ میں وہی ہوتی ہے جو ایک تجربہ کار جہاز راں کے سامنے ساحل سمندر پر خوبصورت سیپیوں کے ساتھ کھیلنے والے بچوں کی۔ ان حکماء اور علماء کے لیے بھی یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک ان پڑھ دیہاتی کے لیے ضروری ہے کہ انبیاء کے سامنے زانوں کے تلمذ تہہ کریں اور ان سے اپنی نجات و سعادت کا وہ علم حاصل کریں جو ان کے بغیر کسی نہیں مل سکتا، جسکے بغیر ان کے تمام علوم و فنون، انکی تمام تحقیقات و کشفیات بیکار بلکہ ان کے لیے وبال ہیں۔ اپنے علوم پر فخر و ناز، اپنے معلومات اور تحقیقات پر قناعت اور انبیاء کے علم سے استغناء ان کے لیے اور ان تمام آبادیوں اور ملکوں کے لیے جو انکی رہنمائی قبول کریں اور اپنی قسمت ان کے سپرد کریں، پیغام ہلاکت ہے۔ جن اشخاص یا قوموں نے اپنے زمانہ کے مروجہ علوم پر اعتماد کر کے انبیاء کی تعلیم و ہدایت سے بے نیازی برتی، وہ ہلاک ہو گئیں۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُرْسِلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ پس جب ان کے پیغمبر ان کے پاس روشن نشانیاں بیکر
فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَخَافَ آئے تو ان لوگوں کے پاس جو غلطراہیت، علم تھا اسی پر ناز
بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَكْبِرُونَ رہے۔ آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی کی پیٹ
میں وہ آ گئے۔

انبیاء کی دعوت | انبیاء کرام کو جب اس حقیقت کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ یہ عالم خدا کا پیدا کیا ہوا ہے اسی کی مملکت ہے اور اسی کے حکم سے یہ پورا نظام چل رہا ہے تو پھر وہ انسانوں کی طرف توجہ کرتے ہیں اور تعجب سے دیکھتے ہیں کہ کائنات اور اسکے تمام اجزاء چارو ناچار جس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں اور طوعاً و کرہاً جسکی فرمانبرداری کر رہے ہیں، انسان اس کائنات کے مجموعہ ہی کا ایک جز رہنے کے باوجود اسکے سامنے اپنے ارادہ اور خواہش سے جھکنے میں تامل کر رہا ہے۔ اگرچہ یہ بلا ارادہ اسکے سامنے جھکا ہوا ہے، اسکے تکوینی احکام و قوانین کے زیر فرمان ہے، اسی کے حکم سے پیدا ہوتا ہے، اسکے

حکم سے نشوونما پاتا ہے، بچہ سے جوان ہوتا ہے اور جوان بوجھ بڑھا، اسی کی پیدا کی ہوئی چیزیں کھاتا ہے، ایسے حکم سے بیمار ہوتا ہے، ایسے حکم سے صحت پاتا ہے، غرض زندگی کی تمام ضروریات میں اور اپنے تمام جسمانی احوال میں خدا کے بنائے ہوئے نظام و قوانین کا اسی طرح تابع ہے جس طرح جمادات و نباتات و حیوانات، لیکن جب اس سے کہا جاتا ہے کہ جس طاقت کے سامنے تو بلا ارادہ جھکا ہوا ہے ایسے سامنے بلا ارادہ بھی جھک جانا تو اسکو اس میں عذر ہوتا ہے۔ انبیاء کرام نے جب پہلی حقیقت کے بالکل برخلاف واقعہ دیکھا اور انہوں نے دیکھا کہ انکی انسانی برادری بہت افراد نے خالق کے بجائے اسکی بعض مخلوقات کے آگے سر جھکایا ہے اور انکی عبادت و اطاعت اختیار کر لی ہے تو انکی زبان سے بے ساختہ نکلا:۔

اَفَخَيْرٌ دِينِ اللّٰهِ يَجْعَلُونَ وَكَلَهُ
 کیا یہ اللہ کی فرمانبرداری کے سوا کسی اور کی فرمانبرداری کرنا
 اسْلَمَ مِنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ
 چاہتے ہیں، حالانکہ اللہ کے سامنے زمین و آسمان کی
 طَوْعًا وَّكَرْهًا وَاِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (آل عمران: ۹۱)
 سب چیزیں اپنی خوشی سے یا مجبوراً جھکی ہوئی ہیں اور
 اللہ ہی کی طرف ان سب کو لوٹ کر جانا ہے۔
 عالم کی یہی فتادگی اور کائنات کا یہی سجود ہے جو قرآن کی آیات سجدہ میں کثرت سے بیان
 کیا گیا ہے:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا
 اور اللہ ہی کے سامنے زمین و آسمان کی تمام مخلوقات
 فِي الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ
 اور فرشتے سر بسجود ہیں اور ان میں خدا کے سامنے بیکرا
 لَا يَسْتَكْبِرُونَ يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ
 کوئی جذبہ نہیں، اپنے رب سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے
 فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (الغفل)
 ہیں اور ان کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔

بس انبیاء کی دعوت یہ ہوتی ہے کہ انسان بھی اسی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کر دے جس کے سامنے ساری کائنات سرفقارہ ہے، کائنات کا ایسا جزو ہو کر زندگی گزارے جو اپنی حرکت اور عمل میں اسکی مجموعی حرکت و رفتار سے ہم آہنگ اور خالق کائنات اور مدبر ارض و سموات کے احکام و قوانین کے تابع ہو

اپنی تمام غلط خواہشات سے، اختیار مطلق العنانی سے، آزادی و خود مختاری کے دعویٰ سے اور اپنے حقوق مالکانہ کے زعم سے دستبردار ہو کر اپنے کو بالکل اسکے حوالے کر دے۔ اسی کا نام ”د اسلام“ ہے جس کی دعوت لیکر تمام انبیاء آئے۔

ظاہر ہے کہ اس ”دین“ اور ”د اسلام“ (طاعت مطلق اور تسلیم کامل) کے بعد اور اس تصور کے سانچہ کہ بالآخر پھر واسطہ اُسی سے پڑے والا ہے (ذکر ایکہ یُزَجَعُونَ) اور اسکے سامنے اس زندگی کا حساب کتاب پیش کرتا ہے، انسان میں مطلق العنانی اور خود مختاری کا جذبہ کسی طرح نہیں پیدا ہو سکتا۔ اسکی زندگی کا نقشہ اسکے دماغ کے سانچے سے ڈھل کر نہیں نکلے گا بلکہ اسی کا تجویز کیا ہوا ہوگا جس نے کائنات کا پورا نقشہ بنایا ہے اور جو خود انسان کا بھی خالق ہے۔ اسکے اخلاق و عادات، سیاست و اجتماع اور احکام و قوانین اسکے اپنے تصنیف کردہ ہوں گے بلکہ اس کو سب خدا کی طرف سے ملیں گے۔

وحی و رسالت کے اس راستہ کے مقابل دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسان اپنے کو اس عالم میں ایک ایسا وجود مستقل فرض کر لے جس کی زندگی کا رخ کائنات کی دوسری چیزوں سے بالکل جدا ہے اور اس میں کسی بالائی طاقت کے زیر فرمان، کسی آسمانی نظام کا تابع اور کسی غیر انسانی عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کا راستہ ہے۔ یہ درحقیقت خدا کی اس سلطنت میں چھوٹی چھوٹی متعدد آزاد اور خود مختار سلطنتیں قائم کر نیکی باغیا نہ کوشش ہے۔

وحی و رسالت تمدن کی بنیاد ہے | انبیاء علیہم السلام انسان کو وہ ابدی علوم و حقائق، زندگی کے وہ قطعی اصول و قواعد اور معاشرت اجتماع کے وہ بے خطا ضوابط عطا کرتے ہیں جنکی پابندی سے صحیح انسانی تہذیب ظہور میں آتی ہے اور جنکی بنیاد پر عادل اور صالح تمدن کا نشوونما ہوتا ہے۔

تمدن انیٹ اور چوڑے، کاغذ اور کپڑوں کے تنوع کا نام نہیں ہے۔ نہ جہولانی تقاضوں کو

انسانی ہنرمندی سے پورا کرنے اور اسکے لیے ایک دوسرے سے تعاون کرنا نام ہے۔ تمدن اس اجتماعی زندگی کا نام ہے جس میں قدرت کے قائم کیے ہوئے حدود قائم رہیں، ہر فرد جماعت کو اس کا واجبی حق ملے، اور عقائد و اخلاق اور قانون و حکومت کے تعاون سے ایک ایسا ماحول پیدا ہو جس میں انسان کو فطرت کا منشا پورا کرنے اور اپنے کمال مطلوب تک پہنچنے میں امداد ملے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ وحی و رسالت کی روشنی اور انبیاء کی رہنمائی کے بغیر انسان نے اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ بنایا تو کبھی وہ اس کو مکمل نہ کر سکا اور اس میں وہ تناسب اور توازن نہ پیدا کر سکا جو ایک صالح انسانی تمدن کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

اصل یہ ہے کہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا کے باغبان ہیں جو اس دنیا کی چمن بندی کرتے رہتے ہیں اور اسکے برگ بار کو چھانٹتے رہتے ہیں۔ جو تمدن انکی مدد کے بغیر آگ آئے اور انکی آبیاری اور نگرانی کے بغیر پرورش پائے وہ خود دو جنگلی درخت کی طرح ہے۔ اس میں وہ تمام عجوبے و تقاضے ہونگے جو جنگل کے خود دو درختوں اور جہارٹیوں میں پائے جاتے ہیں۔ غلبہ یہ ہے کہ وہ میٹھے پھل دینے والے سایہ دار درخت بجائے کڑے یا کسیدے پھل دینے والا خاوار و رست ہی ہوگا۔

انبیاء فطرت کے نباض اور انسانیت کے مزاج داں طبیب ہیں۔ جس تمدن کا خمیر انکی ترکیب اور انکے مشورہ بغیر تیار ہو اس میں کبھی اعتدال نہیں ہو سکتا۔ اُسکے مزاج کا عدم توازن کبھی نہ جائیگا۔ ایسا تمدن جتنی ترقی کرے گا، اسکے چھپے ہوئے عیوب اتنے ہی نمایاں ہوتے جائیں گے اور اسکی بے اعتدالیوں جو اسکی فطرت میں داخل ہیں اتنی ہی ابھرتی جائیں گی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام مشہور تاریخی تمدنوں کے عروج کا زمانہ سب سے زیادہ اجتماعی اور اخلاقی ہنگامہ و تلام کا زمانہ رہا ہے جس میں نظام اجتماعی کی داخلی خرابیاں اور بے اعتدالیوں سطح پر ابھرتی ہیں۔ تمام انسانی تمدنوں کے عروج کے اسی دور میں ازواجی تعلقات

کی خرابی، خانگی زندگی کی ابتری، جنسی اور صنفی کشاکش اور مشکلات، طبقاتی کشمکش، اخلاقی امراض اور اجتماعی بد نظمی سب سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اسکے خاتمہ کا وقت قریب ہو جاتا ہے، گویا اسکے عروج اور اسکی ہلاکت کا زمانہ ایک ہی ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں کہ عقائد (خواہ مذہبی ہوں یا اجتماعی) تمدن کی مستحکم بنیاد ہیں۔ جس تمدن کی بنیاد چند مسلمات اور حقائق پر نہ ہو وہ تمدن بے بنیاد اور بازیچہ اطفال ہے۔ وحی و رسالت ہی صحیح عقائد بنجنتے ہیں اور پھر انکو ثبات و استحکام عطا کرتے ہیں۔ انہیں کے ذریعہ سے انسان کو اخلاق اور اجتماع کے لیے ایسے اساسی مسلمات حاصل ہوتے ہیں جو آسمان و زمین کی طرح پائیدار اور پہاڑوں کی طرح استوار ہوتے ہیں۔ انہیں کی بنیاد پر تہذیب و تمدن کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اخلاق و اجتماع و معاشرت میں وہی بنیاد کا کام دیتے ہیں۔ جب کسی قوم کے ہاتھ سے وحی رسالت کا رشتہ چھوٹ جاتا ہے یا ابتدا ہی سے انبیاء کا واسن اسکے ہاتھ نہیں آتا، تو پھر اسکے نزدیک کوئی حقیقت حقیقت نہیں رہتی۔ بدیہیات، نظریات بنجاتے ہیں اور مسلمات احتمالی مسائل ہو جاتے ہیں۔ اسکے اجتماعی نظریات دن رات صبح شام تبدیل ہوتے ہیں۔ علمی حقیقتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اخلاقی اصطلاحات و تعریفات میں تغیر ہوتا رہتا ہے اور اخلاقی فلسفے منسوخ ہوتے رہتے ہیں۔ خیر و شر اور صلاح و فساد کا کوئی معیار باقی نہیں رہتا۔ کل جو چیز اخلاق تھی آج وہ بد اخلاقی شمار ہوتی ہے۔ آج جبکہ نام ظلم ہے کل عین عدل بن جاتا ہے۔ حقائق اشبار کے فرق سے ذہن نا آشنا ہو جاتے ہیں۔ اسوقت اس قوم کا قوام بگڑ جاتا ہے۔ اسکی اخلاقی حس باطل ہو جاتی ہے۔ آزادی کے پردہ میں سخت انتہاء خیال اور اختلاف عمل پیدا ہوتا ہے۔ اور بالآخر اس میں وہ اجتماعی فوضویت (انارکی) اور اخلاقی اباحت پیدا ہوتی ہے جو اس قوم کا جینا دشوار کر دیتی ہے اور خود اسکی تمبیر کی ہوئی جنت ارضی کو اسکے لیے جہنم اور اسکو دنیا کی دوسری قوموں اور تہذیبوں کے لیے طاعون بنا دیتی ہے۔

تمام انسانی تمدنوں اور تہذیبوں کی تاریخ پڑھ جائیے۔ انکے اجتماعی اور اخلاقی امراض مہلکتا اور بالآخر انکی ہلاکت و تباہی کا اصل سبب مذہبی و اخلاقی عقائد و نظریات کیا ہی تشریلات، مسلمات کا یہی فقدان، اور خیر و شر کے معیاروں کا یہی تغیر و تبدل پایا جائیگا۔ فطرت سلیم، قومی روایات، اور قدیم تربیت کچھ دنوں ضرور اسکی حفاظت کرتی ہیں، مگر یہ بہت کمزور قسم کی چیزیں ہیں۔ یہ قوم کے بحران اور بد اخلاقیوں اور بد نظمیوں کے سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ بد اخلاقیوں اور بد نظمیوں کی پشت پرانگو جائز اور سخت قرار دینے کے لیے مختلف قسم کے اخلاقی اور اجتماعی فلسفے اور علمی نظریے ہوتے ہیں جنکی طاقت فطرت کی آواز کو دبا دیتی ہے اور قومی روایات اور تہذیب کے طلسم کو بھی توڑ دیتی ہے اور رفتہ رفتہ اس قوم کا دامن ہر قسم کے مسلمات اور ہر ایسی چیز سے خالی ہو جاتا ہے جو خیر و شر اور اخلاق و بد اخلاقی کی جانچ کے لیے میزان و معیار کا کام دے سکے۔

اسی طرح وحی و رسالت کی تعلیمات سے انحراف یا ان سے لاعلمی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس زندگی کا تخیل خالص مادی اور انسان کا اپنے متعلق نقطہ نظر خالص حیوانی ہو کر رہ جائے۔ اسی لیے کہ انسان کے پاس اپنے طور پر جتنے ذرائع معلومات ہیں وہ اس کے سوا اور کوئی اطلاع نہیں دیتے۔ اُن سے اس زندگی کے سوا کسی اور زندگی کا پتہ نہیں چلتا، اور مجرد حس اور مشاہدہ سے انسان کی اور کوئی حقیقت اس کے سوا سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ایک ”بوسنے والا جانور“ (حیوان مطلق) ہے۔ یہ عقیدہ اور اعتراف طبعی طور پر انسان کو حیوانیت کے اُس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں جسمانی لذت و الم کے احساس کے سوا کوئی اخلاقی شعور اور اغراض و مصالح کی پرستش کے سوا کوئی مذہب و فلسفہ نہیں رہتا۔ نبوت ہی انسان کو اپنی برتری و شرافت اور انسانیت کا شعور بخشتی ہے اور اسکے ساتھ یہ اور اک بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ ایک مقتدر اعلیٰ، احکام الحاکمین کے زیر فرمان ہے، اسکے سامنے اپنے تمام اعمال و اخلاق کے لیے جوابدہ ہے، یہ دنیا اسی کی سلطنت اور اس دنیا کے رہنے

والے اسی کے بندے ہیں، وہ اس سلطنت میں تصرف کرنے اور اس دنیا کے رہنے والوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں آزاد نہیں ہے۔

پھر نبوت صرف اخلاقی حس کے بیدار کرنے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ انسان کو ایک نظام نامہ اور مفصل ضابطہ اخلاق دیتی ہے، اچھے اخلاق پر اس سے خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کے محل و مقام کا وعدہ کرتی ہے جس سے بہتر عمل کے لیے کوئی محرک ثابت نہیں ہوا، بد اخلاقیوں اور قانون شکنی پر اس کے عذاب اور تہر سے ڈراتی ہے جس سے زیادہ کامیاب مانع دنیا میں موجود نہیں، خدا کے حاضر و ناظر سمیع و بصیر اور عالم الغیب و الشہادہ ہونیکا یقین اس کے دل و دماغ میں پیوست کر دیتی ہے جس سے پُر مدد انسان کو ضبط میں رکھنے والی کوئی اخلاقی طاقت آج تک دریافت نہیں ہو سکی۔ یہی طاقت ہے جو انسان کو جلوت و خلوت شہر اور صحرائیں پابند قانون رکھتی ہے، جو پولیس اور فوج کی طاقت کے بغیر بڑے بڑے جرائم اور صدیوں کی بری عادات کا استیصال کر دیتی ہے، جو زبان کے ایک اشارے سے پوری پوری قوم سے منہ لگی شراب چھڑا دیتی ہے، جو مجرموں کو شہروں اور صحراؤں سے کھینچ کر عدالت میں حاضر کرتی ہے اور انکی زبان سے اپنے جرم کا اقبال کراتی ہے۔

جس اخلاقی نظام کی پشت پر نبوت کی یہ طاقت ہو وہ صرف کتابی فلسفہ ہے جو ایک معمولی جرم کا اسناد بھی نہیں کر سکتا اور محدود سے محدود رقبہ زمین میں بھی کوئی پاکیزہ اخلاقی ماحول نہیں پیدا کر سکتا۔

اسکی بہترین مثال امریکہ کی تحریک منع عمر کی ناکامی اور قانون تحریم عمر کی منسوخی ہے۔ اس تحریک اور قانون کی پشت پر دنیا کی ایک عظیم اور منظم ترین حکومت دریا ستہائے متحدہ امریکہ) ابے پایاں دولت و سرمایہ، اعلیٰ علم و تہذیب اور لائٹھا وسائل نشر و تبلیغ تھے۔ انداز ہے کہ شراب کے خلاف نشر و اشاعت کے سلسلہ میں صرف چھ سال کے اندر ساٹھ سے چھ کروڑ ڈالر صرف ہوئے اور وہ لڑیں جو شائع کیا گیا وہ نو ارب صفحہ پر مشتمل تھا۔ قانون کی تنفیذ کے سلسلہ میں تیرہ سال کے اندر دو سو آدمی مارے گئے۔ ۵۳۴۳۳۵ قید کیے گئے۔ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کے جرم نے عائد کیے گئے۔ چالیس کروڑ چالیس لاکھ پونڈ مالیت کے مالا مال ملک ضبط کی گئیں۔ لیکن ان انتہائی کوششوں کے باوجود امریکہ کی حکومت و قانون اور اس کے اصلاحی ادارے اور انجمنیں اہل ملک کو قانون کی پابندی اور شراب نوشی سے اجتناب پر آمادہ نہ کر سکیں بلکہ اس کے برعکس ان میں سے نوشی کا جنون پیدا کر دیا اور بالآخر جوہر سرسبز کے بعد اس میں جمہوریت کو مجبوراً اس قانون کو منسوخ اور شراب نوشی کو جائز قرار دینا پڑا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ”تفصیلات“ مضمون ”انسانی قانون اور الہی قانون“

جو تمدن اس آسمانی ضابطہ اخلاق سے محروم ہو اور جس قوم کا پہلو اس مذہبی ضمیر سے خالی ہو وہ دنیا ہی میں جہنم کے گڑھے کے کنارے کھڑی ہے۔ اسکی مادی و علمی ترقی، اسکی صنعتی و سیاسی فتوحات، اسکی تخیل کائنات، اسکی ظاہری تہذیب و آداب، اسکے علوم و فنون کوئی چیز اسکو اس گڑھے میں گرنے سے روک نہیں سکتی۔ بلکہ یہ سب چیزیں مل کر اسکے گرنے کی رفتار کو اور تیز کر دیتیگی۔ جو قوم وحی کی حفاظت اور انبیاء کی پاسبانی سے محروم ہو اسکے یہی علوم و آداب (جو انبیاء کی رہنمائی کے بغیر پیدا ہوتے ہیں اور جبکا تخمیر خدا شناس اور پاکباز نہیں ہے) اسکے اخلاقی زوال میں معاون اور اسکے سرگرم کارکن بن جاتے ہیں، اور فواحش کی تبلیغ و اشاعت میں بے حیائی اور بد اخلاقی کو فروغ دینے میں، تہذیب حیا کے پرلے نظریات کو بدلنے اور انکو معیوب قرار دینے اور جرائم و فواحش کو مزین و آراستہ کرنے میں شیطان کے لہجنت کی حیثیت سیکھ کر رہتے ہیں۔ یونان و روم اور جدید یورپ کی اجتماعی و اخلاقی اور ادبی تاریخ اسکی شاہد ہے۔

انسان کی آزادی کی اس راہ میں قانون سنگ گراں ثابت ہو سکتا تھا مگر اسکو انسان نے اپنے راستے سے اس طرح ہٹا دیا کہ وہ خود وضع قانون بن گیا۔ جب قانون کا مخذ و منبع بجائے کتاب آسمانی اور وحی الہی کے انسانی علم و تجربہ قرار پایا اور قانون ساز بجائے خدا کے انسانوں کی کثرت رکایا طاقت تسلیم کی گئی تو راستہ کی تمام رکاوٹ دور ہو گئی۔ انسان کی ترکیب میں شہوانیت اور ہمہمیت داخل ہے۔ وہ فطرۃ بندشوں اور قیود سے آزاد رہنا چاہتا ہے۔ وہ بالطبع لذت جو، اور عیش پسند ہے۔ جب اسکے ساتھ خدا کا خوف اور اپنی ذمہ داری کا احساس بھی نہ ہو تو اسکو کونسا محرک ایسا قانون بنانے پر آمادہ کر سکتا ہے جو خود اس پر بندشیں اور قیود عائد کرے، اسکی آزادی سلب کرے اور اسکے عیش کو منغص کر دے۔ پھر جب یہ قانون ساز انسان ہوں جنکی پرورش ان متنسزل عقائد، ان معکوس نظریات، اس سخی شدہ ذہنیت اور ان فاسد اخلاق میں ہوئی ہو جنکا اوپر تذکرہ ہوا تو ان ایسے قانون وضع

کرنے کی توقع کہاں تک بجا ہے جو جرائم کا انسداد کرے اور جس میں معصیت اور فواحش اور بد اخلاقیوں کے گھسنے کے لیے کوئی رخنہ نہ ہو۔ ان سے تو یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی قانون سازی کی طاقت اور اپنے اقتدار سے بد اخلاقیوں کو سند جواز اور قانونی حیثیت دینگے، انکے دور میں بد اخلاقیوں کا قانون بن جائیگی اور اخلاق خلاف قانون قرار پائیں گے۔ مسخ و نیم مسخ شدہ قوموں کی تاریخ میں یہ واقعہ شاذ نہیں ہے کہ بڑے بڑے جرائم رائے عامہ کی طاقت سے جائز و مستحسن اور مقبول عام بن گئے، پاکبازی سوسائٹی کا جرم بنگلی، پاکبازوں کے لیے اس مجرم سوسائٹی میں رہنے کی گنجائش نہ رہی اور رائج عامہ ہی الزام دیکر انکے اخراج کا مطالبہ کیا کہ۔

اَخْرِجُوا آلَ لُوطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ
وہی جماعت لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو یہ
انہم اَنَامُ يَتَطَهَّرُونَ - وہ لوگ ہیں جو پاکباز رہنا چاہتے ہیں۔

نبوت دنیا میں جو تمدن قائم کرتی ہے اسکی یہ خصوصیت ہے کہ وہ قانون سازی کا حق انسان کو نہیں دیتی۔ اسکے تمدن میں انسان گناہگار نہیں ہو سکتا ہے اور خلاف قانون بھی کر سکتا ہے۔ اسکو اسکے تمدن میں اس کی سزا برداشت کرنی پڑے گی۔ لیکن وہ قانون الہی میں ادنیٰ ترسیم کا بھی مجاز نہیں، اسکے حلال و حرام، زمین و آسمان اور سورج اور چاند کی طرح پائیدار اور نوا میں فطرت کی طرح غیر تبدیل ہیں، بلکہ وہ فطرت ہیں جس میں تغیر و تبدل نہیں۔

فَطَرَهُۥَ ۤاَللّٰهُ الَّتِیْ فِطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا کَانَ
اَللّٰہ کا (انسانی) فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس کے
مَبْدِیُّ لَخَلْقِ الدِّیْنِ اَللّٰہ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ
بننا ہوئے کو کوئی بدل نہیں سکتا، یہی اسنوار اور پائدار دین ہے۔

سلسلہ تاریخ جدید میں بھی اسکی مثالیں ملتی ہیں کہ قانون سازی کی طاقت اور کثرت آراء بعض ایسے اخلاقی و اجتماعی جرائم جنکی شناخت پر نوع انسانی کا اتفاق ہے قانوناً جائز قرار دیے گئے۔ زیادہ دنوں کا واقعہ نہیں نازی دور سے پہلے کی بات ہے کہ جرمنی میں چھ سال تک عمل قوم دلو کے حق میں پروپیگنڈا کیا گیا۔ یزید بر دست اصلاحی کام اُن بزرگ دنیا کی مجلس اصلاح صنفی کے صدر رہ چکے تھے۔ آفرکار ملک کی مجلس قانون ساز نے فطرت آراء سے پیاس کر دیا کہ یہ فعل قانوناً مجرم نہیں ہے صرف شرعیہ ہے کہ طرفین اصرار ہوں اور معمول کے نابالغ بونیک صورت میں اسکا ادنیٰ ایجاب قبول کی رسم ادا کر دے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رسالہ ”میرہ“ میں اسکی اور بھی مثالیں ملیں گی۔

اس لیے اسکے تمدن میں فواحش و محرمات، معاصی و منکرات، عیش و عشرت کے محرکات، لہو و لعب اور غفلت کے اسباب، تمام اخلاقی جرائم اور جرائم آفریں اعمال و اشتغال ہمیشہ ممنوع رہینگے، اور جب تک انکی فطرت اور انسان کی فطرت نہ بدلے۔۔۔ اور ان میں سے کوئی چیز بدلنے والی نہیں۔۔۔ ان کا حکم بھی نہ بدلے گا۔

انسانی قوانین کا مقصد صرف کسی خاص نظام کی تاسیس، امن عامہ کی حفاظت اور اہل مملکت میں نظام قائم کرنا ہوتا ہے، اس لیے وہ انسان کے اُن اعمال و اخلاق سے بحث کرتے ہیں جو سوسائٹی اور عام زندگی پر اثر انداز ہوں۔ انکو شخصی اخلاق اور اندرونی خرابیوں سے بحث نہیں ہوتی۔ ان قوانین کی حیثیت ایک معلم اخلاق اور مصلح کی نہیں ہوتی بلکہ پولیس اور مجسٹریٹ کی ہوتی ہے۔

لیکن آسمانی قوانین کا مقصد محض نظم قائم کرنا نہیں ہے بلکہ انسانوں کو پاکباز اور خدا ترس بنانا ہے۔ اس لیے اُن کے ضوابط میں بعض ایسی چیزیں، ایسے اخلاق اور ایسے مشاغل ممنوع ہونگے جنکی طرف دنیوی قانون سازوں کا ذہن ہی نہ جائیگا۔ ان میں ایسے تمام رخنے بند ہونگے جن سے معصیت و بد اخلاقی سوسائٹی میں داخل ہوتی ہے، جن سے طبعیتوں میں عیش پسندی آتی ہے، قوم میں تن آسانی اور تنعم پیدا ہوتا ہے، غیر اخلاقی رجحانات اور مجرمانہ میلانات پیدا ہوتے ہیں، جن سے سوسائٹی کو گھٹن لگتا ہے جو اندر ہی اندر اسکی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ ایسی سب چیزیں ممنوع ہونگی جو اسکے اخلاقی معیار سے مطابقت نہیں رکھتیں یا اسکے مذہبی اصول سے موافقت نہیں کرتیں۔ اسکا تمدن موسیقی کی ہمت افزائی نہیں کریگا، لہو و لعب اور تفریح میں انہماک کو پسند نہ کریگا، زینت و تفاخر اور مال و دولت کے مقابلہ کو اچھی نظر سے نہ دیکھیگا، یہاں تک کہ بے سود اور غیر ضروری تعمیرات جنکا مقصد شان و شوکت اظہار اور لطف و تفریح کے سوا کچھ ہو، اُس تمدن میں مذموم ہونگی، سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال مطلق اور انکے زیورات اور ریشم کا استعمال مردوں کے لیے

ممنوع ہوگا ، تصاویر اور سچھر کے بت اور انسانی صورتیں مطلقاً حرام اور ممنوع ہونگی۔

انسانی قوانین میں صرف لفظی پابندی ضروری ہوتی ہے اور جرائم سے مانع صرف سزایا پوئیس کا خوف ہوتا ہے۔ جہاں یہ موانع موجود نہ ہوں وہاں جرائم کے ارتکاب میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔ دلوں میں قانون کی عظمت اور اسکا احترام نہیں ہوتا اسلئے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے جن کی تقدیس کا کوئی تخیل لوگوں کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ اکثر قانون ساز اقتدار اور قانون سازی کے منصب پر اپنی ذکاوت یا دولت یا طاقت یا انتخابی کوششوں کی وجہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور اخلاقی حیثیت انکی سطح اور اصولی حیثیت انکی سیرت عام لوگوں کے مقابلہ میں کچھ بلند نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات وہ سخت بد اخلاق بے اصول ، طامع رشوت خوار اور ذلیل ہوتے ہیں ، اس لیے بعض اوقات تو وہ اپنے اغراض و فوائد کے لیے اپنی کمزوریوں اور بد اخلاقیوں کو قانونی سند دینے کے لیے اور بعض اوقات عوام اور رائے دھندوں کی خوشامد کے لیے غلط اصول قوانین بناتے ہیں اور ان میں حسب مصلحت خواہش ترمیم کرتے رہتے ہیں۔ عوام ان کے قوانین کو بجز قبول کرتے ہیں اور ان میں ایک بڑا طبقہ ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ذکاوت اور حیلہ جوئیوں سے انکو عاجز کرنے کی کوشش کرتا ہے اور قانون اہل ملک کے درمیان کشمکش جاری رہتی ہے۔

اسکے برخلاف وحی و رسالت کا لایا ہوا قانون خدا اور رسول پر ایمان رکھنے والوں کے لیے اسی درجہ مقدس اور قابل عزت ہوتا ہے جس درجہ ان کا مذہبی صحیفہ اور خود انکا پیغمبر۔ وہاں اسکو اپنی ہوشیاری سے ہر آنے والا عاجز و مغلوب کرنے اور اسکو تنگ اور دق کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا کہ یہ عمل عین کفر اور بغاوت ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ سَخَوْا فِیْ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو ہر آنے کی کوشش کی

انکے لیے بلا کا دردناک عذاب ہے۔

أُولَٰئِكَ لَمْ يَخَفُوا مِنْ رَجْحِ الْإِيمِ (سبا)

وہاں صرف قانون کی لفظی پابندی اور ظاہری و جسمانی شکل کافی نہیں بلکہ پابندی قانون کی روح

بھی ضروری ہے کیونکہ قانون ساز اور حاکم (اللہ) غیب سے واقف ہے، ظاہر اور باطن سے آگاہ ہے، اور اسکو ظاہری قانونی پابندی سے دنیا کے حاکموں کی طرح دھوکہ نہیں دیا جاسکتا۔

لَنْ يَنَالَهُ اللَّهُ لُحُومُهَُا وَكَذٰلِكَ مَا تَمٰا
وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِثْكُمْ
ان قربانیوں کے گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتا
بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

جو قانون ان خصوصیات کا مالک ہوگا، اسکے تمدنی اثرات کیا ہوں گے؟ وہ موسائٹی میں کس درجہ کی پاکبازی، طہارت و عفت، امانت و دیانت، تہذیب و حیا پیدا کریگا؟ اور جب ان لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت آئیگی اور انکو زمین کے کسی حصہ میں اقتدار حاصل ہوگا جو مذہب و اجتماع و اخلاق اور معاشرت و تہذیب کے بارہ میں ایسے ثابت شدہ حقائق، ایسے غیر متزلزل عقائد رکھتے ہیں جو انکو علم و اطلاع کے ابدی اور دائمی صاف اور محفوظ سرچشمہ سے حاصل ہوئے ہیں اور جو فطرت کے اعلیٰ قوانین کی طرح غیر متبدل اور غیر منسوخ ہیں، جنکی تربیت ان اخلاق میں ہوئی جو انسانی ہوا و ہوس سے پاک اور خدا کی صفات کا پر تو ہیں، جنکا قانون شریعت الہی کا دوسرا نام ہے، جو قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شٰهِدُوْا لِلّٰهِ (عدل و انصاف کے ذمہ دار اور ملتزم اور اللہ کے گواہ) ہیں، تو انکی حکومت و اقتدار کے نتائج و ثمرات کیا اس سے مختلف ہونگے جسکی قرآن نے پیشین گوئی کی ہے :

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنٰهُمْ فِيْ اَمْرٍ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوْا الزَّكٰوةَ وَآَمَرُوْا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج)
یہ وہ لوگ ہیں جنکو اگر ہم زمین میں صاحب اقتدار کریں تو وہ نماز کو قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے عبادی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

اور ان کے طبعی طور پر جو تمدن اور طرز زندگی وجود میں آئیگا، کیا اسکی پاکبازی اور پابندی میں کسی

شک ہو سکتا ہے؟ اسکے برخلاف جو تمدن ان لوگوں کے ہاتھوں قائم ہوا اور جو سوسائٹی ان کے ذریعہ وجود میں آئے جو مذہب، اخلاق و اجتماع اور تہذیب انسانی کے یا تو سرے سے کچھ حقائق و مسلمات ہی نہ رکھتے ہوں یا ان کے پاس چند ذوقیات اور وجدانیات ہوں، جنکی تفہیم سورج کی گردش کے ساتھ بدلتی رہتی ہو، جنکے پاس خیر و شر اور مذہم و ستھن کی تمیز کے لیے کوئی پائیدار معیار اور اخلاقی قدروں کے وزن کرنیکے لیے کوئی عادل میزان نہ ہو، جنکے یہاں اخلاق، اغراض و مصالح کا نام ہو اور جنکا قانون خود انہیں کا بنایا ہوا اور انکے علم و تجربہ اور ضرورت و مصلحت کی تابع ہو، جنکی حکومت شخصی یا نسلی یا قومی اقتدار کا ذریعہ اور اسکی خادم ہو، اور اسکا دنیا میں کوئی اصلاحی مشن نہ ہو، جسکی بنیاد کسی اصول اور اخلاقی فلسفہ پر نہ ہو، تو اس تمدن اور اس سوسائٹی میں کیا انسان کو اپنی فطرت کا منشا پورا کرنے اور اپنے کمال مطلوب تک پہنچنے میں امداد مل سکتی ہے؟ اور اگر اس نے کچھ عمر پائی، اور اسکی جڑیں زمین میں گہری چلی گئیں تو کیا انسان اپنی فطرت اصلی پر قائم بھی رہ سکیگا، اور اسکو اپنا کمال مطلوب یاد بھی رہیگا؟ اس تمدن کو انسانی تمدن کہنے کی وجہ اسکے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ ان لوگوں نے قائم کیا ہے جو اپنی شکل و صورت میں انسان ہیں اگرچہ وہ اپنے طرز زندگی میں بے جان شبینہیں، اپنی ذہنیت اور تربیت کے لحاظ سے بے شعور جانور اور اپنے مشاغل و اعمال کے لحاظ سے خونخوار درندہ ہیں۔